سیر وسوانح

شیخ علی طنطاوی کی 'ذکریات'
مطالعہ وتجزیہ

ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

دور جدید کے عرب ادباء میں شیخ علی طنطاوی کا نام اس حیثیت سے کافی معروف ہے کہ ان کا قلم ایک طرف زبان وادب کے اعتبار سے اعلیٰ نمونہ ہے تو دوسری طرف انسانیت، اخلاق اور مذہب کی مضبوط اساس اور اصول ومبادی پر قائم ہے۔ وہ عصری اداروں سے فارغ التحصیل تھے، لیکن خاندانی پس منظر اور علماء ومشائخ کے فیضِ صحبت کی وجہ سے اسلام اور اس کی تعلیمات ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی تھیں۔ عنفوانِ شباب سے انھوں نے تحریر وتقریر سے اپنے شغف اور دلچسپی کا اظہار کیا تو اس کے مظاہر زندگی کے آخری لمحے تک علم وادب کی دنیا کے سامنے آتے رہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اخبارات و جرائد میں ان کے جو مقالات شائع ہوئے وہ دس ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں۔ (المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی المعاصر، انور الجندی، مطبعۃ الرسالۃ، القاہرۃ، ۱۹۶۲ء، ص ۷۶۰) ان کی متعدد وقیع تصنیفات ہیں جن میں ادب، تنقید، اصلاحِ معاشرہ، سیر وسوانح، سفرنامے، احساسات، الغرض مختلف اور متنوع موضوعات پر کلام کیا گیا ہے۔ وہ ایک مضبوط اور مستحکم فکر اور نظریے کے مالک تھے۔ اس کی اساس اسلام اور عربی زبان پر گہرے ایمان ویقین پر قائم ہے۔ اس ایمان میں سچائی، حرارت اور جذباتیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بلاشبہ وہ صحیح معنیٰ میں قدیم وجدید اسلوب کے سنگم تھے۔ انھوں نے قدیم عربی سرمایے سے مواد حاصل کیا اور اسے عصری اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ وہ نیا نظر آنے لگا۔ یوں تو ان تحریروں میں مقالہ،

افسانہ، اجتماعی اصلاح، ادبی تنقید اور اسلامی مباحث سے متعلق وافر ذخیرہ موجود ہے، لیکن اپنے آباء و اجداد کی تاریخ سے انھیں جنون کی حد تک عشق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس تاریخ کو صحیح انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ دنیا کی تمام اقوام کی تاریخ سے بے نیاز ہو جائیں گے اور صرف مسلم شخصیات کے کارناموں سے دلچسپی کا اظہار کریں گے۔ (المحافظة والتجدید، ص۷۶۰) وہ مغرب سے استفادہ کے قائل تھے، لیکن اندھی تقلید نہیں، بلکہ ہوش وخرد اور نقد وتبصرہ کے ساتھ۔ وہ صرف مفید اور کارآمد باتوں تک یہ استفادہ محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ادب کے ذریعے دین وملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے، اسے لہو ولعب اور سیر وتفریح کا ذریعہ بنانے سے سخت متنفر تھے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ فرانسیسی استعمار کے تحت گزرا تھا، اس لیے اس کے خلاف جو غم وغصہ پوری قوم میں پایا جاتا تھا اس میں وہ بھی برابر کے شریک تھے۔ اس کے باعث وہ ہر جابر وظالم حکومت کے ہمیشہ مخالف اور عزت وشرافت اور حریت ومساوات کے علم بردار رہے۔ ان کے افکار وخیالات سے واقفیت کا سب سے بہترین ذریعہ ان کی تصنیفات ہیں۔ اس وقت ان کی ایک اہم تصنیف 'ذکریات' کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے ان کے افکار وخیالات کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی۔

یہ کتاب شیخ علی طنطاوی کی یادوں کا مجموعہ ہے۔ وہ انھیں مرتب کرنے کا کوئی خاص منصوبہ رکھتے تھے، نہ ان کے پاس کوئی ڈائری ہوتی تھی جس سے رجوع کر سکیں۔ کبرسنی کی وجہ سے حافظہ بے حد کمزور ہو گیا تھا، لیکن ان کے بعض عقیدت مندوں نے اصرار کر کے انھیں ان یادوں کو مرتب کرنے پر آمادہ کیا۔ ابتداء میں اندازہ تھا کہ یہ یادیں چند قسطوں میں سمٹ جائیں گی، لیکن جب ان کو لکھنے کا آغاز کیا تو وہ وسعت اختیار کرتی گئیں (ذکریات، دار المنارة للنشر، المملكة العربية السعودية، ۱۹۸۵ء ۱/ ۵-۶) اور صرف ۳۲ سال کی یادیں یعنی ۱۳۵۹ھ تک کے حالات تقریباً بارہ سو (۱۲۰۰) صفحات پر پھیل گئے۔ مصنف نے کسی ایک واقعہ، حالت یا مرحلے کی وضاحت کے لیے ایک حلقہ قائم کیا ہے اور اس پر نمبر ڈالے ہیں۔

مذکورہ بتیس (۳۲) سال کی یادداشتیں کل ایک سوتیس (۱۳۰) حلقوں پر مشتمل ہیں (۱/۷) اور چار جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ پیش نظر مقالہ میں اس کی دو جلدوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ۶۴ حلقے ہیں اور وہ صرف ۱۹۳۳ء تک کے حالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے یہ مجلّہ 'المسلمون' اور مجلّہ 'الشرق الاوسط' میں قسط وار شائع ہوئی تھیں، اسی لیے اس میں کہیں کہیں قارئین کے تاثرات بھی درج ہیں۔

مصنف نے بڑی تفصیل سے یہ وضاحت کردی ہے کہ یہ ان کی منتشر اور بکھری ہوئی یادیں ہیں، جن میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس کتاب کا نام 'مذکّرات' نہیں، بلکہ 'ذکریات' رکھا ہے۔ مذکّرات میں تسلسل اور ترتیب ہوتی ہے اور پہلے سے تحریر کردہ مواد سے مدد لی جاتی ہے، لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے موجود یادوں کے بعض دھندلے نقوش ہیں۔ قوت حافظہ کم زور ہونے کی وجہ سے انھیں یکجا کرنا بھی مشکل ہے، تاہم مصنف نے اپنی حد تک کوشش کی ہے کہ مفید اور کار آمد یادداشتوں کا ایک قابل لحاظ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کردیں۔ (۱/۹-۱۰) چنانچہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مطالعہ سے انتہائی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ان سب کے مجموعی مواد سے فی الواقع ایک شخص ہی نہیں، بلکہ ایک عہد کی تاریخ سامنے آجاتی ہے۔ آئندہ سطور میں اس کتاب سے اخذ کردہ ضروری معلومات ایک خاص ترتیب کے مطابق پیش کی جارہی ہیں۔

شیخ علی بن مصطفیٰ بن احمد سبط الطنطاوی کی پیدائش ۲۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۷ھ کو دمشق میں ہوئی۔ ان کا اصل وطن مصر تھا۔ (۱/۱۳۲) لیکن ان کے آباء واجداد ۱۲۵۵ھ میں دمشق منتقل ہوگئے تھے۔ چونکہ مصر میں ان کے گاؤں کا نام ''طنطا'' تھا، اس لیے دمشق میں ان کو طنطاوی کا لقب دیا گیا۔ ان کے آباء واجداد نے تعلیم اور معاش کی خاطر گھر سے ہجرت کی تھی، اس لیے دمشق میں یہ دونوں مقاصد ان کی تمام مساعی کے مرکز تھے۔ ان میں سے بعض حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور بعض نے حکومت کے فوجی

امور و مسائل کی نگرانی کی۔ شیخ علی طنطاوی کے دادا احمد طنطاوی عثمانی فوج میں ملازم تھے۔ (۱/۱۳۳-۱۳۸) ان کے والد شیخ مصطفیٰ طنطاوی شام کے جیّد عالم اور مشہور فقیہ تھے۔ ان کا شمار فقہ حنفی کے چند نمایاں لوگوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے دارالافتاء میں سکریٹری شپ کی ذمہ داری انجام دی، بعد میں 'محکمۃ النقض والتمیز' کے صدر بنادیے گئے تھے۔ انھیں سلطان شریف فیصل کے زمانے میں اہم شرعی مسائل پر بحث ومباحثہ اور غور وتدبر کے سلسلے میں مدعو کیا جاتا تھا۔ دمشق کے مشہور علماء و مشائخ سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ گھر پر ان لوگوں کی علمی نشستیں ہوتی رہتی تھیں، جن میں کبھی کبھی بہت اہم علمی مسائل چھڑ جایا کرتے تھے۔ (۱/۱۷۵-۱۷۸) ان کی والدہ رئیفہ بنت الشیخ ابی الفتح الخطیب دین دار اور اطاعت شعار خاتون تھیں، ان کی تربیت اور پرورش ایک سنجیدہ اور متدیّن گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان اصلاً بغداد کا رہنے والا تھا، لیکن دوصدی قبل دمشق منتقل ہوگیا تھا۔ اس میں بڑے بڑے علماء اور ائمہ گزرے۔ ان میں شیخ عبدالقادر الخطیب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ (۱/۲۰۱-۲۰۲) ان کی والدہ کے حقیقی بھائی شیخ محبّ الدین الخطیب مجلّہ 'الفتح' کے مدیر اور 'جمعیۃ الشبان المسلمین' کے بانی تھے۔ انھوں نے مستقل طور سے مصر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ (۱/۲۵۹-۲۶۱)

شیخ علی طنطاوی کی ابتدائی تعلیم گھر اور محلے کے مکتب میں ہوئی۔ پھر ۱۹۱۴ء میں انھیں 'مدرسہ تجاریۃ' میں داخل کردیا گیا۔ یہ شام کے تین بڑے کالجوں میں سے ایک تھا، جہاں ثانویہ تک کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کالج کے پرنسپل ان کے والد شیخ مصطفیٰ طنطاوی تھے۔ وہاں وہ چار سال زیر تعلیم رہے۔ (۱/۲۹۰)

۱۹۱۸ء میں، جب کہ شیخ طنطاوی مذکورہ کالج میں پانچویں کلاس کے طالب علم تھے، مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ترک دیارِ عرب سے ہمیشہ کے لیے نکال دیے گئے۔ عربوں کو اپنی فتح پر بے حد ناز تھا۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ ترکوں کی تمام یادگاریں ختم کی جارہی تھیں۔ ترکی زبان میں تحریر شدہ تمام چیزیں عربی زبان میں تحریر کی جارہی تھیں۔

اس کے اثرات ان کے کالج پر بھی پڑے۔ اس میں ترکی ترانے کی جگہ عربی ترانہ پڑھا جانے لگا اور اس کا نام اور جھنڈا تبدیل کر دیا گیا۔ معاملہ یہیں تک محدود نہیں رہا، بلکہ کچھ ہی دنوں میں اِسے بند کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا، کیونکہ اسے ترکوں نے قائم کیا تھا اور ان کی انجمن 'جمعیت اتحاد و ترقی' سے اس کا معمولی تعلق تھا۔ (۱/ ۴۹-۵۲)

اس کالج کے بند ہونے کے بعد شیخ طنطاوی کے والد نے 'مدرسہ سلطانیہ ثانیہ' میں ان کا داخلہ کرا دیا۔ اس اسکول میں ذریعۂ تعلیم عربی تھی۔ یہاں صبح کا ترانہ بھی عربی میں پیش کیا جاتا تھا اور غیر ملکی زبانوں میں فرانسیسی کے بجائے انگریزی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ یہاں ابتدائی اور ثانوی درجات تک تعلیم ہوتی تھی۔ یہ اسکول بھی ترکوں کا قائم کردہ تھا۔ اس کے پرنسپل، اساتذہ اور دیگر منتظمین کافی دلچسپی اور محنت سے اپنا کام انجام دیتے تھے۔ اس اسکول میں ان کا داخلہ پانچویں کلاس میں ہوا تھا، حالانکہ اس سے پہلے وہ 'مدرسہ تجاریہ' سے درجہ پانچ پاس کر چکے تھے۔ (۱/ ۵۷-۶۰) اس اسکول کے پہلے سال یعنی ۱۹۲۰ء میں امیر فیصل کو شام، لبنان اور فلسطین کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ یہ گویا عرب قوم پرستی کی ایک بڑی فتح تھی۔ ہر جانب خوشیوں اور مسرتوں کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ مقررین اور شعراء کی تو عید ہو گئی تھی۔ (۱/ ۶۱-۶۲) لیکن ابھی اس فتح کا جشن ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ فرانسیسیوں نے شام پر حملہ کر دیا اور 'میدان میسلون' میں عربوں کا اقتدار اپنے عہدِ طفولت ہی میں زوال کا شکار ہو گیا۔ شام کی تاریخ کا یہ ایک عظیم سانحہ تھا۔ (۱/ ۶۵-۶۸)

شیخ طنطاوی 'مدرسہ سلطانیہ ثانیہ' کے دوسرے سال میں داخل ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد نے انھیں یہاں سے نکال کر 'مدرسۂ جقمقیہ' میں داخل کر دیا۔ جقمقیہ ایک عمارت کا نام ہے جسے جقمق (م ۸۲۴ھ) نے تعمیر کیا تھا۔ یہ عمارت سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرہ کے پاس واقع ہے۔ (۱/ ۶۸) اس کے پرنسپل شیخ عید السفر جلانی صحیح معنی میں 'معلم شام' کہے جانے کے مستحق ہیں۔ وہ حدیث، فقہ اور عربی زبان و ادب پر قادر تھے۔ طنطاوی کو ان سے مختلف حیثیتوں میں استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اس اسکول میں دینی و عصری درس گاہوں کے فارغ التحصیل اساتذہ کی ایک اچھی ٹیم موجود تھی۔ اس کی وجہ

سے طلبہ بیک وقت جدید وقدیم اسلوب سے بہرہ ور ہوتے تھے اور بجا طور سے وہ ان دونوں کے حامل بن جایا کرتے تھے۔(۱/۶۹-۷۱)

مدرسہ جمقمیہ وہ پہلا اسکول ہے جس کے اثرات کو مصنف نے اپنی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ذاتی طور سے محسوس کیا۔اس سے قبل جن اداروں میں انھوں نے تعلیم حاصل کی تھی، مختلف اسباب کی بنیاد پر ان کے اثرات کی کارفرمائی واضح طور سے نظر نہیں آتی۔اس اسکول کے پرنسپل اور اساتذہ کی شفقت ومحبت اور پیشۂ تدریس سے ان کی مکمل وابستگی اور دلچسپی سے وہ بہت متاثر تھے۔مدرسۂ جمقمیہ سے وابستگی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ طنطاوی نے جامع اموی کے حلقہائے درس وتدریس میں پابندی سے شرکت کی اور ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔یہ مسجد مدرسے کے شمالی گیٹ کے عین سامنے واقع تھی۔یہ عالم اسلام کی چند اہم مساجد میں سے ایک ہے۔مدرسہ کے طلبہ کے لیے یہ مسجد عبادت گاہ، تفریح گاہ اور درس گاہ سب کچھ تھی۔یہاں عالم اسلام کے جید علماء، فقہاء اور محدثین انتہائی پابندی سے اپنے اپنے موضوع پر درس دیا کرتے تھے۔اس میں مبلّغین اور واعظین کے بھی مشہور حلقے تھے۔الغرض پوری مسجد ایک درس گاہ بنی ہوئی تھی۔(۱/۷۶-۷۹) مدرسۂ جمقمیہ کے دیگر طلبہ کی طرح شیخ علی طنطاوی نے بھی اس سے خوب استفادہ کیا۔(۱/۸۱-۸۲) لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ان کے والد نے دمشق کے محلّہ صالحیہ میں ایک نیا مکان کرایہ پر لے لیا۔یہ مکان بے حد کشادہ اور انتہائی پرفضا مقام پر واقع تھا۔اس نقل مکانی کی وجہ سے انھیں ۱۹۲۱ء میں 'مدرسہ انموذج المہاجرین' میں داخلہ لینا پڑا۔سوء اتفاق سے یہاں ان کا داخلہ پھر پانچویں کلاس میں ہوا۔اس سے قبل وہ دو بار درجہ پانچ پاس کر چکے تھے، لیکن اسکول کی تبدیلی اور نصابِ تعلیم کے تغیر کی وجہ سے انھیں تیسری بار اسی کلاس میں لوٹنا پڑا۔تاہم وہ اسے عمر کا ضیاع نہیں سمجھتے، بلکہ مختلف اداروں کی علمی وادبی فضا سے مستفید ہونے کی وجہ سے اس پر فخر محسوس کرتے ہیں۔(۱/۸۵-۸۶)

'مدرسہ انموذج المہاجرین' ایک حکومتی ادارہ تھا۔اس کا پرنسپل ایک عیسائی تھا۔یہاں کا ماحول مدرسۂ جمقمیہ سے بالکل مختلف تھا۔یہاں شیخ عید السفر جلانی جیسی کوئی

شخصیت نہیں تھی۔(۱/۸۹) شام میں فرانسیسی سامراج کی جڑیں مضبوط ہوچکی تھیں اور قوم کی طرف سے جدو جہد آزادی کا آغاز ہوگیا تھا، جس کا اختتام آزادی اور فتح پر ہوا۔ فرانسیسی سامراج کے اثرات اسکولوں اور کالجوں پر بھی پڑے۔ وہاں نصاب میں تیزی سے تبدیلیاں کی گئیں۔ تاہم علی طنطاوی نے اپنے گھریلو پس منظر کی وجہ سے خود کو غلط ماحول سے محفوظ رکھا اور اسکول کے ماہر اساتذہ سے اپنی بساط بھر کسبِ فیض کیا۔ وہ ہمیشہ اسکول سے واپس آ کر گھر کی لائبریری میں مصروف ہوجایا کرتے تھے اور کتابیں خواہ ان کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، الٹتے پلٹتے رہتے تھے۔(۱/۹۳) اسکول کے امتحان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ تقریری ہوتا تھا اور اس میں طالب علم کے گرد ذی علم اور باصلاحیت لوگوں کی ایک ٹیم بیٹھ جایا کرتی تھی جو زبانی سوالات کرتی تھی۔ شروع میں یہ سوالات بالعموم مشکل ہوا کرتے تھے، بعد میں آسان ہوتے تھے۔ اسی لیے طالب علم ہمیشہ بعد میں جانے کی کوشش کرتا تھا۔ شیخ طنطاوی ان امتحانات میں کافی صبر وسکون سے شرکت کرتے تھے اور ہر سوال کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اس اسکول کے آخری امتحان میں اخلاقیات کے علاوہ ہر پرچے میں دس میں دس نمبر حاصل ہوئے تھے۔ اخلاقیات میں نمبر کم ہونے کی وجہ فرانسیسی اقتدار کی مخالفت تھی۔ (۱/۹۷-۹۹)

شیخ علی طنطاوی اس اسکول سے پرائمری کی سند حاصل کرنے کے بعد 'مکتب عنبر' میں داخل ہوگئے۔ یہ شام کا سب سے مشہور اور اہم ثانوی اسکول تھا۔ یہ وطن پرست تحریکوں اور افراد کا مرکز تھا۔ شام کے تقریباً تمام بڑے لوگوں نے اس اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔(۱/۱۰۵) شیخ علی طنطاوی کے ذاتی ارتقاء میں اس اسکول کا بڑا دخل ہے۔ اس سے ان کے فکر وعمل کو ایک نیا رخ ملا۔ اس اسکول میں گزرا ہوا زمانہ ان کے لیے بے حد اہم اور خوش گوار تھا۔ اس میں انھوں نے جن اساتذہ سے علم حاصل کیا اور جو کتابیں پڑھیں وہ ان کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ثابت ہوئیں۔(۱/۱۱۶-۱۲۱) اسی اسکول میں انھیں زندگی کے تلخ تجربات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس دور میں شام کے

لیے آزادی کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں۔انھوں نے ان میں سے بعض میں سرگرم حصہ لیا، پھر دوران تعلیم ہی والد بزرگ وار اللہ کو پیارے ہوگئے، جس کی وجہ سے انھیں حصول معاش کی فکر دامن گیر ہوئی اور اس سلسلے میں مختلف تجربات کیے۔(۱/۱۷۷) لیکن حالات نے انھیں دوبارہ اسی اسکول میں واپس لوٹا دیا اور وہ یہاں سے نوجوانوں کے ایک عظیم قائد بن کر نکلے۔

'مکتب عنبر' قدیم دمشق کے ایک محلّہ 'خراب' میں واقع تھا۔اس کی شہرت کی وجہ سے طلبہ دور دور سے یہاں تحصیل علم کے لیے آتے تھے۔ ان میں سے بعض طلبہ B.A پاس ہوتے تھے۔ (۱/۱۰۷-۱۰۸) عنبر ایک آدمی کا نام تھا جس نے یہ عمارت تعمیر کی تھی۔(۱/۱۲۱) شیخ طنطاوی اس میں ۱۹۲۳ء میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں انور عطار اور زکی المحاسنی بعد میں کافی مشہور ہوئے۔(۱/۱۱۳) یوں تو ان کے اساتذہ میں سب ہی اپنے فن کے ماہر تھے، لیکن شیخ عبدالرحمان سلام، سلیم الجندی اور استاذ عبدالقادر المبارک کی بات ہی کچھ اور تھی۔(۱۱۶-۱۲۰) شیخ سلام انشا پردازی اور خطابت ، سلیم الجندی لغت، نحو اور علم عروض اور استاذ مبارک لغوی روایات میں اپنی مثال آپ تھے۔(۱۵۴-۱۵۶) ان اساتذہ کے علاوہ شیخ داؤدی اور مشہور شامی شاعر استاذ محمد البزم کی بھی علمی و ادبی فیوض و برکات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔عربی زبان و ادب کے علاوہ عصری علوم کے ماہر اساتذہ کی بھی ایک جماعت اس اسکول میں موجود تھی۔(۱۵۶-۱۵۷)

'مکتب عنبر' سے متعلق یادیں علی طنطاوی کو سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ وہ اپنے خونی رشتوں کے بالمقابل اس کالج کے طلبہ، اساتذہ، ماحول اور منتظمین سے زیادہ لگاؤ محسوس کرتے ہیں، (۱/۱۴۹) چنانچہ انھوں نے بہت تفصیل سے ان امور پر بحث کی ہے۔اس کے نصاب تعلیم کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ آج کل کے کالجوں کے نصاب سے بہت زیادہ طویل اور وسیع تھا۔اس کے پڑھنے پڑھانے میں طلبہ اور اساتذہ دونوں بہت محنت کرتے تھے۔بیش تر اساتذہ باصلاحیت اور اپنے مضمون کے ماہر تھے۔حالات کی ناسازگاری اور غیر ملکیوں سے کشمکش کی وجہ سے ہر شخص کو مستقبل کی بہترین تعمیر کی

فکر تھی۔ شیخ طنطاوی کو اس کالج سے سب سے زیادہ فائدہ عربی زبان اور عربی علوم وفنون پر قدرت حاصل کرنے میں ملا اور اس کا اصل سہرا استاذ مبارک اور استاذ سلیم الجندی کو جاتا ہے، استاذ مبارک عربی زبان کے الفاظ کی شرح وتوضیح کا ایک منفرد انداز رکھتے تھے۔ وہ بہت مختصر الفاظ میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔ اس سے ذہن میں حقائق پوری طرح محفوظ رہ جاتے تھے۔ جہاں تک استاذ سلیم الجندی کا معاملہ ہے تو وہ ایک خاموش طبع آدمی تھے۔ وہ تقریری اندازِ تدریس کے مخالف تھے۔ طلبہ کے اندر غور وفکر کرنے اور ٹھہر کر سوچنے کی عادت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کسی لفظ کا معنیٰ بتانے سے پہلے اشتقاق اور اعراب وغیرہ کی وضاحت ضروری سمجھتے تھے۔ نحو وصرف کی جس کتاب کی تعلیم دیتے طلبہ ان کے ملاحظات سے کئی کئی کاپیاں بھر لیتے تھے۔ (۱/۱۵۳-۱۵۶)

علی طنطاوی نے جب 'مکتب عنبر' میں داخلہ لیا تھا تو اس وقت گرچہ ان کی عمر پندرہ سال سے زائد نہیں تھی، لیکن علمی اعتبار سے وہ اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے پاس معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔ وہ اپنے گھر کے کتب خانہ کی اکثر کتابیں اٹھاتے، دیکھتے اور پڑھتے رہتے تھے۔ اگر کوئی کتاب پسند نہیں آتی تو کم از کم اس کا نام اور اس کے مصنف کا نام یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کم عمری میں ان کے شوقِ مطالعہ کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پرائمری کے دوران 'کتاب الاغانی' کے بہت سے ابواب کا مطالعہ کرلیا تھا۔ منفلوطی کی بعض کتابیں اور مجلّہ 'رابطہ ادبیہ' کے بعض شمارے بھی ان کے زیر مطالعہ رہے تھے۔ (۱/۱۶۰-۱۶۱) ان کی تعلیم وتربیت میں شروع سے جدید وقدیم عناصر کی بیک وقت آمیزش رہی۔ ایک طرف وہ اپنے والد کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے علماء ومشائخ کے قدیم ازہری اسلوبِ تکلّم سے مستفید ہوتے تھے تو دوسری طرف پرائمری سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم تک جدید اسلوبِ نگارش اور طرز ادا سے متمتّع ہوتے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ حقیقی معنیٰ میں جدید وقدیم کے سنگم بن گئے، لیکن ان کا اصل ذریعۂ تربیت ان کا ذاتی مطالعہ ہی تھا۔ ان کا بیش تر وقت مطالعہ میں گزرتا تھا۔ ان کا ایک دن کا اوسط مطالعہ ایک سو صفحات کا ہے، اس طرح انھوں نے اپنی

زندگی میں کم از کم ستّر ہزار صفحات کا مطالعہ کیا۔(۱/۱۶۲-۱۶۳)

۱۹۲۵ء میں، جب شام پر فرانسیسی قبضہ کے پانچ سال مکمل ہو چکے تھے، برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے شام کا دورہ کیا۔ مسئلہ فلسطین کے بارے میں تمام یورپی ممالک خاص طور سے برطانیہ کی خباثتیں سب لوگوں پر عیاں تھیں۔ اس لیے 'مکتب عنبر' کے طلبہ نے اس کے خلاف احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ وہ پوسٹرس، بینرس اور پلے کارڈس لے کر سڑکوں پر نکل آئے۔ عوام نے بھی ان کا ساتھ دیا۔(۱/۱۶۸-۱۷۰) طلبہ کا یہ احتجاج شام کی ۱۹۲۵ء کی مسلّح جہدِ آزادی کا ایک بڑا سبب بن گیا۔ اس مسلّح عوامی تحریکِ آزادی نے فرانسیسیوں کا شام میں عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس انقلاب کے پیچھے دوسرے اسباب میں 'نہضۃ المشایخ' کی سرگرمیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ 'نہضۃ المشایخ' شام کے جید علماء کی اس جماعت کا نام ہے جس نے عوام سے بعض دینی مقاصد کے تحت رابطہ قائم کیا۔ اس میں شیخ بدرالدین، شیخ علی درقر اور شیخ ہاشم خطیب کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس جماعت نے شام کے تمام شہروں، قصبات اور دیہاتوں کا دورہ کیا۔ لوگوں کے سامنے وعظ و تلقین کی اور اسلامی حکومت کے قیام کے تعلق سے ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور ان کا ساتھ دینے کے لیے ہر طرح سے آمادہ ہو گئے۔ اس طرح یہ دورہ انقلاب کی آمد کا ایک اہم سبب بن گیا۔ اس جماعت کی کوششوں کا اعتراف خود فرانسیسیوں نے بھی کیا۔(۱/۲۱۸-۲۱۹) اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب بھی انقلاب کی آگ بھڑکانے کا سبب بنے۔(۱/۲۲۰-۲۲۴) اس انقلاب میں اور ذرائع کی طرح شعر و شاعری سے بھی مدد لی گئی۔ علی طنطاوی نے خود بعض ایسے قصائد لوگوں کے سامنے پیش کیے جن سے ان کی حمیت و غیرت بھڑک اٹھی۔ اس انقلاب کے تعلق سے احمد شوقی، خیر الدین زرکلی، خلیل مردم بک، احمد شفیق جبری اور محمد البزم کے قصائد بہت زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے شعراء کے اشعار پسند کیے گئے۔(۲۲۵-۲۴۰)

'مکتب عنبر' میں تعلیم کے دوران ان کی ذاتی زندگی میں ایک سانحہ یہ پیش آیا کہ

۱۳۴۳ھ میں ان کے والد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۷ سال تھی اور وہ آٹھویں کلاس میں تھے۔ اس اچانک حادثے کا ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ والد صاحب ایک معروف علمی شخصیت کے مالک تھے، اس لیے ان کے جنازے میں بہت زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ بعد میں تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ بہت طویل رہا۔ (۱/۱۷۵-۱۷۹) انتقال کے بعد شیخ طنطاوی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے گھر کی مالی کفالت کا تھا۔ والد صاحب نے ترکے میں کوئی خاص رقم نہیں چھوڑی تھی۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ایک بہن اور تین بھائیوں کے علاوہ والدہ بھی باحیات تھیں۔ سب سے پہلے انھوں نے 'نہضۃ المشایخ' کے زیر اہتمام قائم ایک اسکول میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی۔ یہ ایک دینی مدرسہ تھا اور اس کا قیام حکومت کے زیر اہتمام چلنے والے اسکولوں کے غلط نظام تعلیم کے مضر اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ادارہ کے منتظمین سے طنطاوی کا اختلاف ہوگیا اور انھوں نے اس سے علیٰحدگی اختیار کرلی۔ (۱/۱۸۵-۱۸۶) پھر چونکہ 'ثانویہ' کی ڈگری لینے میں ایک سال رہ گیا تھا اس لیے انھوں نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد انھوں نے الگ سے حساب اور ریاضی میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سے تاجروں کے یہاں محرر اور محاسب کی حیثیت سے کام کیا۔ ایک بار خود بھی تجارت کرنے کی کوشش کی۔ (۱/۱۸۶-۱۸۹) لیکن بہت جلد ان پر واضح ہوگیا کہ ان کے مزاج سے تجارت کا کوئی میل نہیں ہے۔ اس دوران اپنے بعض مخلصوں کے مشورہ پر انھیں مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ وہ 'مکتب عنبر' آئے تو اس کے منتظم نے انھیں داخلہ لینے کی اجازت اس شرط پر دی کہ وہ امتحان میں اچھے نمبر لے آئیں گے۔ چنانچہ انھوں نے امتحان میں شرکت کی اور جب نتیجہ نکلا تو وہ طلبہ میں سب سے آگے تھے۔ (۱/۱۹۰) یہ ۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد اصولاً انھیں اگلی کلاس میں داخلہ مل جانا چاہیے تھا، لیکن اس زمانے میں فرانسیسیوں نے شام کا تعلیمی نظام اپنے ملک کے نظام کے مطابق چلانے کے لیے بی اے کا کورس متعارف کیا اور اس

میں داخلہ کے لیے ایک امتحان بھی رکھ دیا۔ تیاری کے لیے وقت بہت کم تھا، لیکن بہر حال وہ شریک ہوئے اور کامیاب قرار دیے گئے۔ (۱/۲۴۱) بی اے کا کورس مکمل کرنے کے بعد وہ اس کے امتحان میں شریک ہوئے۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو انھیں کامیاب قرار دیا گیا، اس سے انھیں بے انتہا خوشی ہوئی اس طرح اب ان کے نام کے ساتھ ''بکالوریا فی الآداب'' لکھا جانے لگا۔ (۱/۲۴۲-۲۴۳)

۱۹۲۸ء میں ان کے ماموں الاستاذ محبّ الدین الخطیب نے انھیں ایک خط لکھ کر مصر آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے اس خط میں ان کی بہن کا اپنے ایک شریک کاروبار 'عبدالفتاح قتلانی' کے ساتھ رشتہ تجویز کیا تھا۔ اسے گھر کے لوگوں نے قبول کرلیا اور وہ اپنی بہن کے ساتھ مصر روانہ ہوگئے۔ ان کی روانگی ستمبر ۱۹۲۸ء میں ریل گاڑی کے ذریعہ ہوئی۔ دوسرے دن کی رات بارہ بجے کے قریب وہ قاہرہ پہنچے۔ وہاں لوگوں کی چہل پہل اور گہما گہمی دیکھ کر انھیں تعجب ہوا، کیونکہ دمشق میں اس وقت سناٹا طاری ہوجاتا تھا۔ گھر پہنچ کر کھانے وغیرہ سے فارغ ہوئے اور سونے کی کوشش کی، لیکن نئی جگہ اور نئے ماحول کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ اس کے بعد دو تین دن وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ مصر کے تاریخی مقامات، باغات اور دریائے نیل کی سیر کرتے رہے۔ ان کے ماموں ایک مصروف آدمی تھے، اس لیے ان کی معیت کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ (۱/۲۴۳-۲۵۶)

مصر کا یہ سفر ان کی زندگی کا ایک تاریخی موڑ ثابت ہوا۔ اس سے ان کی ذات، فکر اور طریقۂ کار پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ (۱/۲۴۹) مصر میں ان دنوں طہٰ حسین کی کتاب 'فی الشعر الجاہلی' اور شیخ عبدالرزاق کی کتاب 'الاسلام واصول الحکم' کی اشاعت کی وجہ سے مخلص اور صحیح العقیدہ علماء اور ادباء کی ایک جماعت کو اسلام اور اس کی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کی فکر دامن گیر ہوگئی تھی۔ (۱/۲۵۶) اس کے نتیجہ میں مجلّہ 'الفتح' کا اجراء اور 'جمعیۃ الشبان المسلمین' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ گویا بیسویں صدی میں دعوت اسلامی کی ابتدا تھی۔ مجلّہ 'الفتح' کی اشاعت ۱۹۲۶ء میں عمل میں آئی۔ (۱/۲۵۹) مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ، ان کی اصلاح و ہدایت، جدید و قدیم کے درمیان رابطے کی استواری اور ملکی

وبین الاقوامی مسائل میں مسلمانوں کو صحیح زاویۂ نظر کی طرف رہ نمائی میں اس مجلّے کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جہاں تک 'جمعیۃ الشبان المسلمین' کا معاملہ ہے تو اس کے قیام میں بھی ان کے ماموں کا بہت بڑا رول ہے۔ ابتدا میں اس کی سرگرمیاں مخفی رکھی گئیں، پھر جب حلقۂ تعارف وسیع ہوا تو باضابطہ ایک جلسۂ عام میں اس کے ذمہ داروں کو متعارف کرایا گیا۔ اس وقت اس کے صدر عبدالحمید سعید، سکریٹری محبّ الدین الخطیب اور خازن احمد تیمور پاشا تھے۔ (۱/۲۶۰-۲۶۱) الاستاذ سید محمد خضر حسین ابتداء میں اس تنظیم کے ساتھ تھے، لیکن بعد میں انھوں نے الگ سے 'جمعیۃ الہدایۃ الإسلامیۃ' کے نام سے ایک جماعت بنالی۔ یوں تو یہ دونوں جماعتیں مصر کے دینی حلقوں میں متعارف تھیں، لیکن ان کی سرگرمیاں کوئی خاص نتیجہ نہیں لاسکیں۔ نتیجے کے اعتبار سے دعوت کا اصل کام شیخ حسن البنّاؒ نے انجام دیا جو جدید تعلیم یافتہ، قادرالکلام اور موثر شخصیت کے مالک تھے۔ (۱/۲۶۱-۲۶۲)

شیخ علی طنطاوی مصر میں دو ماہ قیام کے بعد دمشق واپس لوٹ آئے اور یہاں ان تجربات اور خطوط کار کے مطابق کام کرنا شروع کیا جو انھوں نے مصر میں دیکھے یا حاصل کیے۔ وہ خطابت اور صحافت میں سرگرم حصہ لینے لگے اور اپنے بعض ساتھیوں کے مشورہ سے 'جمعیۃ الشبان المسلمین' کے طرز پر 'جمعیۃ الہدایۃ الاسلامیۃ' کے نام سے ایک اسلامی تنظیم کی داغ بیل ڈالی، یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ تھا۔ اس کا اصل مقصد شامی معاشرہ میں رائج بدعات وخرافات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور اصلاح کی سنجیدہ کوشش کرنا تھا۔ انھوں نے بعض غلط رسوم وروایات کے خلاف مقالات لکھے اور انھیں پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا۔ (۱/۲۶۵-۲۷۳)

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک کا زمانہ طنطاوی کے لیے تبدیلیوں اور تغیرات کا زمانہ تھا۔ انھوں نے اس میں مختلف نوعیت کے کام انجام دیے، علماء ومشائخ کی صحبت اختیار کی، پرجوش اور مؤثر تقریریں کی، طلبہ کی قیادت کا فریضہ انجام دیا، اخبارات وجرائد میں مضامین لکھے، مقامی مکاتب میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ڈرامہ نگاری اور اس کی پیش کش کا شوق پورا کیا۔ اسی دوران فلسفہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور

'بکالوریوس فی الآداب والفلسفۃ' کے لقب سے نوازے گئے۔(۲۷۵)

تعلیم مکمل کر لینے کے بعد شیخ طنطاوی مستقل سکونت کی غرض سے قاہرہ چلے گئے، وہاں انھوں نے مصری یونیورسٹی میں داخلے کی غرض سے اپنی اسناد پیش کیں۔ آرٹس فیکلٹی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر طہ حسین اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے ہوئی۔ مؤخرالذکر سے یہ ملاقات مسلسل دوستی اور محبت میں تبدیل ہوگئی۔ ان دنوں مصر میں ڈاکٹر طہ حسین کی بدنام زمانہ کتاب 'فی الشعر الجاہلی' پر زبردست ہنگامہ برپا تھا۔ اسے ہوا دینے میں ان کے ماموں شیخ محبّ الدین الخطیب اور ان کے پریس کا بڑا دخل تھا۔ اس کی وجہ سے طہ حسین کے ان سے تعلقات خراب ہوگئے۔ چنانچہ انھوں نے یونیورسٹی چھوڑ کر 'دارالعلوم العلیا' میں داخلہ لے لیا۔ یہاں ڈرامہ نگاری سے ان کی دل چسپی ابھر کر سامنے آئی اور وہ بہت جلد طلبہ میں بے حد مقبول ہوگئے۔ لیکن یہاں ان کا دل نہیں لگا اور وہ اسے چھوڑ کر دمشق واپس چلے آئے۔(۱/۲۷۵-۲۷۶)

دمشق واپس آئے تو یونی ورسٹی (الجامعۃ السوریۃ) میں داخلے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ طنطاوی کو گھریلو ضروریات کی وجہ سے کسی مناسب ذریعۂ معاش کی تلاش تھی۔ چنانچہ انھوں نے کئی ایک پرائمری اسکولوں میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اسی دوران میں انھیں یونیورسٹی سے ایک ملحق کالج میں بھی جز وقتی تدریس کا موقعہ ملا۔ یہاں انھوں نے بشّار بن برد سے متعلق لکچرس دیے اور انھیں یکجا کر کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا۔ اسی سال وہ باضابطہ طور سے صحافت کے میدان میں داخل ہوئے۔(۱/۲۷۸-۲۸۲) ویسے اس سے قبل وقتاً فوقتاً ان کی مقالات شامی اور مصری جرائد میں شائع ہوتے رہے تھے۔ صحافت سے باضابطہ وابستگی کے بعد جن اخبارات و جرائد میں انھوں نے کام کیا یا ان میں ان کے مقالات شائع ہوئے ان میں اخبار 'فتیٰ العرب'، اخبار 'الف باء' مجلّہ 'الناقد' اور مجلّہ 'القبس' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔(۲/۹-۳۳)

شیخ علی طنطاوی علماء و مشائخ اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان تال میل کے قائل تھے۔ بد قسمتی سے اس وقت شام میں بھی ان دونوں طبقوں کے درمیان فاصلے موجود

تھے۔ دونوں کے اسالیب، طرز ہائے ادا وطریقۂ فکر جدا جدا تھے۔ شیخ علی طنطاوی جدید تعلیم سے آراستہ تھے، لیکن علماء ومشائخ کی صحبت سے قدیم علوم پر بھی ان کو دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے ۱۳۴۸ھ میں بعض ایسے پمفلٹس شائع کیے جن میں اسلام کی سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے تعلق سے علماء ومشائخ اور جدید تعلیم یافتہ طبقے دونوں پر یکساں تنقید بھی تھی۔ اس تنقید کی زد بعض حکومتی اداروں پر بھی پڑی۔ ان پمفلٹس کا نام 'رسائل الاصلاح' تھا۔ ان کی اشاعت کے بعد ہر طبقے کی طرف سے ان کی مخالفت شروع ہوگئی۔ (۲/۳۵-۴۲) اس کے بعد انھوں نے 'رسائل سیف الاسلام' کے نام سے پمفلٹس کی اشاعت کا ایک دوسرا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں انھوں نے بعض باطل افکار ونظریات کے علاوہ نماز کی اہمیت، دعوت اسلامی کے وجوب، قومی ادب اور مہدی موعود پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔ (۲/۴۳-۴۹)

شیخ علی طنطاوی بچپن سے تنہا زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ ان کا محبوب مشغلہ تقریر وتحریر اور درس ومطالعہ تھا، لیکن ملکی حالات اور بعض اساتذہ اور طلبہ کی تحریک وتشویق پر وہ سیاست کے میدان میں اترنے پر مجبور ہوگئے اور اپنی تقریری صلاحیت، جوش وجذبہ، طرز استدلال اور وسیع معلومات کی وجہ سے عوام وخواص میں بہت جلد مقبول ہوگئے۔ (۲/۵۵-۵۶) یہاں تک کہ وہ ۱۹۲۹ء میں 'اللجنۃ العلیا لطلاب سوریا' کے صدر بنادیے گئے۔ یہ 'الکتلۃ الوطنیۃ' وطن پرستوں کی ایک تنظیم تھی، اس کی طلبہ شاخ تھی۔ اس میں طلبہ کی تعداد اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھی، لیکن اس کے اثرات پورے ملک میں محسوس کیے جاتے تھے۔ (۲/۶۲-۶۷) ۱۹۳۱ء میں جب 'الکتلۃ الوطنیۃ' نے 'الأیام' کے نام سے ایک ترجمان نکالنے کا فیصلہ کیا تو شیخ طنطاوی کو اس کا داخلی مدیر بنادیا گیا۔ اس کے چیف ایڈیٹر شام کی مشہور علمی وادبی شخصیت الاستاذ عارف النکدی تھے۔ اس کی خبروں کے انتخاب کا کام خاص طور سے شیخ طنطاوی کے ذمہ تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۳ برس تھی۔ (۲/۷۹-۸۰) اس دوران دسمبر ۱۹۳۱ء میں عام انتخابات کا اعلان ہوا۔ مگر حکومت کی جانب سے بے ضابطگیوں کو دیکھ کر عوام نے احتجاج کردیا اور معاملہ مسلح ٹکراؤ تک

جا پہنچا۔ 'الکتلۃ الوطنیۃ' نے اس انتخاب کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ جریدہ 'الایام' نے قوم کی مدافعت اور فرانسیسیوں پر تنقید میں دن بدن سختی کر دی، جس سے تنگ آ کر حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی۔ (۲/۹۳-۱۰۳) پارٹی نے 'الیوم' کے نام سے دوسرا جریدہ نکالا، لیکن کچھ ہی دنوں میں اسے بھی بند کر دیا گیا۔ (۲/۱۰۳) کچھ ہی دنوں میں ان کے ایک دوست کی کوششوں سے انھیں وزارت معارف سے تقرر نامہ مل گیا۔ اس کی رو سے انھیں حمص اور حماۃ کے درمیان مشرق میں واقع ایک گاؤں 'سلمیہ' کے مکتب میں تدریس کی خدمت انجام دینی تھی۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ (۲/۱۰۳-۱۰۶)

شیخ علی الطنطاوی فلسفہ سے بی اے کرنے کے بعد مصر چلے گئے تھے۔ وہاں سے واپس آئے تو یونیورسٹی میں داخلے کا وقت ختم ہو گیا تھا، چنانچہ انھوں نے صحافت اور تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا، لیکن ساتھ ہی حتی الامکان اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کو نکھارنے میں بھی مصروف رہے، چنانچہ 'مدرسۃ الآداب العلیا' میں داخلہ لے لیا۔ ان دنوں یہ شام کی وزارت معارف کی براہ راست نگرانی میں چل رہا تھا۔ یونیورسٹی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کی سند اس زمانے کی سب سے اہم اور معتبر سند مانی جاتی تھی، کیونکہ اس میں 'کلیۃ الآداب' کے مضامین کے علاوہ اور بہت سے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس ادارے میں شیخ طنطاوی کے اہم اساتذہ میں الاستاذ شفیق جبری، شیخ عبدالقادر المغربی، شیخ سعید البانی، سلیم الجندی اور الاستاذ مبارک تھے۔ (۲/۱۹۸-۲۰۱)

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ طنطاوی نے مذکورہ ادارے سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی، لیکن ظاہر ہے علمی و ادبی استفادہ تو خوب کیا۔ انھیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا، چنانچہ نومبر ۱۹۳۰ء میں انھوں نے شامی یونیورسٹی کی لافیکلٹی (کلیۃ الحقوق) میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۳۳ء تک اس کے باقاعدہ طالب علم رہے۔ اس وقت یونیورسٹی میں ایک فیکلٹی اور تھی، جس کا نام کلیۃ الطب (میڈیسن فیکلٹی) تھا۔ (۲/۱۶۴-۱۶۵) شیخ طنطاوی نے اس میں قانون کے بہت سے مضامین کی سبقاً سبقاً تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کے اساتذہ میں فارس بک خوری، شیخ ابوالیسر عابدین، سعید

محاسن، فرانسیسی استاذ ستیف اور فایز خوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔(۲/۱۶۶-۱۷۳) انھوں نے تعلیم کے ساتھ تدریس اور صحافت سے بھی اپنا تعلق باقی رکھا، اس کے علاوہ ملکی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیتے رہے۔(۲/۱۷۵-۱۷۶)

شعبۂ قانون میں تعلیم کے دوران شیخ طنطاوی کے ساتھ ایک بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۱ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔(۲/۱۰۹) والد کے انتقال کے بعد تمام بھائی بہنوں کے لیے ماں ہی واحد سہارا تھیں۔ وہ ایک دین دار اور محنتی خاتون تھیں۔ انھوں نے بچوں کا اپنی بساط بھر خیال رکھا اور انھیں باپ کی جدائی کا احساس نہیں ہونے دیا۔(۲/۱۲۰-۱۲۲) ان کے انتقال سے طنطاوی کو بہت شدید دھچکا لگا۔ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ لیکن پھر موت کو ایک حقیقت سمجھ کر اسے تسلیم کرلیا۔ انھوں نے اپنی ماں کے انتقال اور بعد کے احوال جس طرح قلم بند کیے ہیں وہ ایک طرف ماں سے بیٹے کے والہانہ تعلق کو واضح کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ زبان و بیان کے اعلیٰ نمونے ہیں۔(۲/۱۲۵-۱۳۳)

شعبۂ قانون میں تعلیم اور 'سلمیہ' گاؤں میں تدریس کے باوجود طنطاوی نے اپنی سیاسی مصروفیات جاری رکھیں۔ وہ فرانسیسی اقتدار کے خلاف سینہ سپر تھے اور طلبہ کی قیادت کا عظیم کام انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ اسی درمیان انھوں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لیے کوچنگ کا اہتمام کیا۔ ان کی علمی صلاحیت اور جدید ذرائع کے استعمال کی وجہ سے یہ کوچنگ بہت کامیاب رہی۔ ان کے پاس طلبہ کی ایک بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی۔(۲/۱۵۰-۱۵۲) ۱۹۳۱ء کا ایک واقعہ مجلّہ 'البعث' کی اشاعت تھی۔ مختلف دینی مقاصد کے تحت اسے شام کی ایک تنظیم 'جمعیۃ التعلیم والتہذیب' نکالتی تھی۔ شیخ طنطاوی اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اس میں ان کی خدمات اعزازی تھیں۔(۲/۱۵۲-۱۵۳)

'مدرسہ سلمیۃ' میں شیخ طنطاوی کی ملازمت کا زمانہ تین ماہ سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے پرنسپل، اساتذہ اور طلبہ سے انھیں ایک قسم کا تعلق اور لگاؤ ہوگیا تھا۔ اسکول میں انھیں تاریخ، انشاپردازی اور خطابت سے متعلق مضامین پڑھانے کے لیے دیے گئے

تھے۔ انھوں نے پوری محنت، لگن اور دلچسپی سے ان مضامین کو طلبہ کے ذہن میں مستحضر کرنے کی کوشش کی۔ امتحان کے بعد گرمائی تعطیلات گزارنے وہ گھر چلے آئے اور پھر ان کا دوبارہ جانا ممکن نہیں ہوا، (۲/۲۱۹-۲۲۸) کیونکہ انھیں ستمبر ۱۹۳۲ء میں ایک دوسرے مقام 'سقبا' کے اسکول میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ دمشق کے گرد و نواح میں سرسبز و شاداب علاقے کے عین وسط میں واقع تھا۔ بعد میں دمشق ہی کا ایک حصہ بن گیا۔ اس مدرسے میں ان کی حیثیت پرنسپل کی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی مدرسے کا نظم سنبھال رہے تھے۔ انھوں نے مدرسے کی صفائی ستھرائی اور اس میں شجر کاری کرائی۔ اسکول کے اسٹاف میں اضافہ کیا۔ بچوں کی اخلاقی تربیت پر توجہ دی۔ (۲/۲۶۳-۲۷۲)

مذکورہ بالا دونوں مدارس میں تدریس کے دوران طنطاوی کی سیاسی اور سماجی مصروفیات حسب سابق جاری رہیں۔ انھوں نے ملازمت کو اپنی حریت اور حمیت کے لیے خطرہ نہیں بننے دیا۔ وہ مختلف محاذوں پر سرگرمِ عمل تھے۔ طلبہ کی قیادت، اخبارات میں مضامین کی اشاعت، علماء و مشائخ کی صحبت اور اسلامی تنظیموں سے رابطہ، الغرض بہت سے محاذ تھے جن پر وہ ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ جب چاہتے مسجد کے منبر پر تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ لوگ ان کی آواز سے مانوس ہو گئے تھے، اس لیے وہ فوراً گوش بر آواز ہو جاتے تھے۔ (۲/۲۷۳) اس زمانے میں ان کے جو مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے وہ زیادہ تر وطن کی آزادی سے متعلق تھے، لیکن ادبی تنقید، تاریخی قصے، فلمی نقد و تبصرے اور ذاتی افکار و خواطر سے بھی یہ خالی نہیں ہوتے تھے۔ (۲/۲۷۴) ان کا ایک پسندیدہ موضوع 'فلسطین' تھا جو مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں اس مسئلے پر کئی مضامین لکھ کر اس کے حقائق اور انجام سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ ان مضامین میں بعض ایسے خطرات اور اندیشوں کی نشان دہی کی تھی جو بعد میں صحیح ثابت ہوئے۔ (۲/۲۷۴-۲۸۲) اسی زمانے میں انھوں نے حافظ ابراہیم کے انتقال پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ دمشق میں اس عظیم عرب شاعر کے انتقال کے دو ماہ بعد تک کوئی تعزیتی جلسہ نہیں ہوا تھا۔ انھوں نے اس پر اپنے سخت تعجب اور حیرت کا اظہار کیا۔ ان کے اس

مضمون سے دمشق کے علمی اور ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی اور فوراً تعزیتی جلسے منعقد کیے گئے۔(۲/۲۳۶-۲۴۰)

کتاب پر ایک تجزیاتی نظر

شیخ علی طنطاوی کی یہ کتاب ان کی منتشر اور بکھری ہوئی یادوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کوئی باضابطہ خودنوشت سوانح حیات نہیں ہے، اس میں کسی طرح کی ترتیب اور تسلسل کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف کے پاس یادوں کا کوئی تحریری ذخیرہ نہیں تھا۔ مختلف واقعات کے تعلق سے جو یادیں ان کے ذہن میں باقی رہ گئی تھیں بس ان ہی کو قلم بند کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان یادوں کو تحریر کرتے ہوئے مصنف نے کئی بار اس سلسلہ کو روکنے کی کوشش کی، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ ایک لاحاصل اور بے فائدہ کوشش معلوم ہوتی تھی۔ تاہم اپنی عمر کے لحاظ سے مزید کوئی ٹھوس علمی کام کرنے کی سکت نہ ہونے اور ایک معمر فرد کے تجربات سے نئی نسل کو کچھ فائدے پہنچنے کی موہوم امید سے وہ یہ سلسلہ پھر شروع کر دیتے تھے۔ انھیں ان یادوں کی تاریخی اہمیت کے بارے میں بھی شک تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ کسی سپہ سالار، امیر کبیر یا بادشاہ وقت کی یادیں نہیں تھیں، یہ محض ایک لکھنے پڑھنے والے فرد کی یادیں تھیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنے بجائے دوسروں کے بارے میں بات کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔(۱/۱۱۶) انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ یادیں جرح وتعدیل اور تحقیق و تفتیش کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی ہیں۔ یہ کام تو مؤرخین اور راویوں کا ہے۔ انھوں نے صرف اپنے ذاتی احساسات وجذبات کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔(۱/۲۶۵) وہ یادوں کے اس سلسلے کے طویل ہونے اور سفر زندگی کی روداد لکھنے میں اپنی سست روی پر اظہار افسوس کرتے اور آئندہ تیز چلنے کا عزم کرتے ہیں۔(۱/۸۱) وہ انسان کے مزاج اور جسم میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ یادیں فرد واحد کی نہیں بلکہ بہت سے افراد کی ہیں۔(۱/۱۸۳) اپنے حافظہ کی کم زوری اور ذہن سے

بہت سی قیمتی یادوں کے محو ہو جانے کی مثال دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ان یادوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی آفس میں کچھ کاغذات رکھے ہوں، اچانک ان پر پانی پھیل جانے کی وجہ سے ان کے حروف اور سطریں مٹ گئی ہوں، بس چند صفحات باقی رہ گئے ہوں''۔(۱/۱۸۵)

اس کتاب میں کثرت سے اصل مباحث کے ساتھ دوسرے امور و مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ اسے عربی زبان میں 'استطراد' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کتاب کے متعدد مقامات پر اپنی اس کم زوری کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں معذرت خواہ ہوں ۔ میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جو اپنے کھیتوں کے درمیان پیدل چل رہا ہو۔ بس اسے کسی باغ کا منظر بہت پسند آجائے اور وہ اس میں ٹہلتا ہوا دور نکل جائے۔ اسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکے کہ اب اسے کہاں جانا ہے؟ عربی ادب کا جن لوگوں نے بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے استطراد ان کی مجبوری بن جاتا ہے، خاص طور سے جاحظ کا مطالعہ کرنے والا تو اس کا ضرور عادی ہو جائے گا۔ وہ استطراد کے بانی ہیں ...... یہ ایک ایسی کم زوری ہے جس سے میں نجات نہیں پا سکتا۔ پس اسے برداشت کیجیے۔ زیادہ سے زیادہ مدیر حضرات سے درخواست کیجیے کہ وہ کچھ کاٹ چھانٹ کر دیا کریں''۔(۲/۷۳)

اس کتاب میں اگر استطراد کی مثالیں تلاش کی جائیں تو کثیر تعداد میں ملیں گی۔ صورت حال یہ ہے کہ پورے پورے ابواب استطراد کے طور پر موجود ہیں۔ بقیہ بیچ بیچ میں تو یہ ہر صفحے پر موجود ہے۔ جہاں کہیں بھی دمشق، دریائے بردیٰ اور جبل قاسیون کا نام آتا ہے مصنف بے اختیار ماضی کی یادوں میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر یادوں کا ایک طویل سلسلہ صفحۂ قرطاس کی زینت بن جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ان کا معمول ہے کہ وہ ایک یاد سے دوسری یاد اور ایک تذکرے سے دوسرے تذکرے کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً کسی ایک شاعر کا ذکر ہو رہا ہو تو پھر تمام معاصر شعراء کا ذکر آجاتا ہے۔ اسی

طرح ایک استاذ کا ذکر آتا ہے تو پھر بہت سے اساتذہ یاد آجاتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ مصنف کو اسلام، اسلامی تعلیمات، مسلمانوں کے مسائل، مسلم ثقافت اور مسلم قوم کی تعمیر وترقی اور کردار سازی کی بے حد فکر ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں کے درمیان میں جگہ جگہ اللہ، رسول، آخرت اور حساب وکتاب کا ذکر کرتے ہیں۔ انھیں عثمانی خلافت کے زوال پر بے حد افسوس ہے۔ وہ اسے یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کی سازشوں کے خلاف ایک مضبوط محاذ تصور کرتے ہیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا وغیرہ کو وہ یہودیوں کا ایجنٹ قرار دیتے ہیں۔ (۲/۳۶) انھوں نے عالم اسلام پر عثمانی خلافت کو ایک نعمت قرار دیا ہے۔ وہ اسے برا بھلا کہنے والوں کو صحیح نقطۂ نظر کا حامل نہیں سمجھتے۔ (۱/۸۸)

شیخ طنطاوی نے اسلامی تعلیمات پیش کرنے کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ مختلف افراد، واقعات اور حوادث کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں مناسب موقع پر کوئی دینی تعلیم پیش کردی ہے، مثلاً اپنے ساتھیوں اور اساتذہ میں سے بیش تر کی رحلت کا ذکر کرکے دنیا کی بے ثباتی اور اس کے فنا ہونے پر روشنی ڈالی، مسئلہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے جہاد اور اس کی فضیلت سے لوگوں کو آگاہ کیا، اپنے زمانے کے سنجیدہ ماحول کا تذکرہ کرکے آج کے بگڑے ہوئے معاشرے پر لعن طعن کی، وغیرہ۔ مسلم ممالک کے مسائل میں وہ سب سے زیادہ مغربی استعماریت کو اہمیت دیتے ہیں، چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے۔ انگریزوں کی غدّاری، فرانس میں شام کی بے جا مداخلت، قدیم شام کی تقسیم، فلسطینی ریاست کے قیام اور فلسطین ولبنان میں یہودیوں کے مظالم پر انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہودیوں کو وہ چنگیز اور ہلاکو خاں سے بڑا ظالم سمجھتے ہیں۔ (۲/۵۷-۵۸)

اسلام اور مسلمانوں سے ان کی گہری محبت اور تعلق کا اظہار اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تر علمی وادبی صلاحیتوں کو اسلام کی نشر واشاعت اور ملّت کی خدمت کے لیے وقف کردیا۔ یہ صرف ان کی ذاتی زندگی تک محدود نہ رہا، بلکہ

انھوں نے معاصر ادباء اور شعراء کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا۔ اس سے ادب اور ادیب کے بارے میں ان کے مستقل نظریات کا پتا چلتا ہے۔

شیخ علی طنطاوی کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ بڑے ہی زیادہ جری اور بے باک ہیں۔ اپنی عزت نفس کا پاس ولحاظ ان کے یہاں سب سے مقدم ہے۔ وہ اسلام یا اسلامی شعائر کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ یادوں کے اس مجموعہ میں انھوں نے جا بجا اپنے اس جذبہ کا تذکرہ کیا اور اس کے عملی مظاہر پیش کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''مجھ پر ایام شباب سے جرأت و بے باکی اور اقدام کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ واقعۃً میں صاف گو اور تیز زبان واقع ہوا ہوں۔ میں اگر کوئی بات کہتا ہوں تو نتائج کی پروا نہیں کرتا''۔ (۲/۵۴)

انھوں نے ایک مقام پر اس کی مزید تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ زندگی میں ان کی سب سے قیمتی متاع ان کی عزت و کرامت ہے۔ وہ اللہ کے علاوہ کسی کے آگے اپنی گردن نہیں جھکا سکتے۔ کسی حاکم اور رئیس کے سامنے جھکنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ان کا جائز ادب واحترام اپنی جگہ پر، لیکن اس سے آگے اور کسی عمل کی کوئی گنجائش نہیں۔ (۲/۲۱۰)

ان کی جرأت و ہمت کا بہترین مظاہرہ اس وقت ہوا جب ایک فرانسیسی افسر نے ان کے اسکول کا دورہ کرنا چاہا۔ اس موقعہ سے اس کے استقبال کا ایک پروگرام رکھا گیا، لیکن انھوں نے اس کے خلاف ایک پرجوش تقریر کی۔ اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی، مگر یہ تقریر اس قدر مؤثر اور جامع تھی کہ تقریباً تمام طلبہ اور نصف اساتذہ نے استقبالیہ پروگرام میں شرکت نہیں کی۔ (۱/۹۹)

کتاب 'ذکریات' معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ صحیح معنیٰ میں اپنے دور کی ترجمان ہے۔ شام کے سیاسی اور سماجی حالات سے متعلق بعض بڑی اہم باتیں اس سے ہمارے علم میں آتی ہیں۔ شامی انقلاب کے ایک عینی شاہد کی یہ روداد سفر انقلاب سے

متعلق بعض ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے اور بعض ایسی شخصیات کے کارناموں سے واقف کراتی ہے جو اب تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ اس میں اس وقت کے تعلیمی نظام، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کا بھی مفید تعارف موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دمشق اور وہاں کے قدرتی مناظر کا ایک جاذب نظر اور دل کش نقشہ پیش کر دیا ہے۔ ایک ایسا نقشہ جسے پڑھ کر اسے دیکھنے کا بے اختیار دل چاہنے لگتا ہے۔ اس میں دمشق کی آب وہوا، مکانات، سڑکیں، ندیاں، پہاڑ، رسم ورواج، کھانے پینے کی اشیاء اور طور طریقے، الغرض بہت کچھ تفصیلات موجود ہیں۔ طنطاوی دمشق کے بار بار تذکرہ کو اپنی مجبوری بتاتے ہیں، کیوں کہ ان کے بقول اس کی محبت ان کی رگ وپے میں سرایت کر گئی ہے۔

انھوں نے اس کتاب میں متعدد مقامات پر دمشق اور جامع اموی کی تاریخ بیان کی ہے۔ ان کے مطابق دمشق دنیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ یہ بنوامیہ اور بنوایوب کا پایۂ تخت رہا ہے۔ دنیا کے ایک تہائی حصے پر اس کی حکومت رہ چکی ہے۔ (۱۲۶/۲) اگر دار خضراء سے کوئی حکم صادر ہوتا تھا تو مشرق ومغرب میں فوراً نافذ ہو جاتا تھا۔ پھر وہ اس کے انجامِ بد اور اس کے عواقب پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ (۹۶/۱) دمشق کے فطری مناظر میں وہ سب سے زیادہ اس کے سرسبز وشاداب علاقوں (غوطۃ دمشق) سے متأثر ہیں۔ جبل قاسیون کی خاموشی اور شہر پر اس کے سایۂ عاطفت کا بھی وہ بڑے تأثر کے ساتھ بار بار تذکرہ کرتے ہیں۔ (۹۰/۱) جہاں تک جامع اموی کا تعلق ہے تو یہ دمشق کا قلب ہے۔ اسی طرح جیسے مکہ کا قلب حرم پاک اور قاہرہ کا قلب جامعہ ازہر ہے۔ یہ عالم اسلام کی چار بڑی اور قدیم مساجد میں سے ایک ہے۔ (۱۲۶/۲) دمشق کا تذکرہ اور اس کا تعارف کثرت سے پیش کرنے کے باوجود مصنف کی جذباتی تسکین نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''میں ان کی تصویر کشی سے قاصر ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ الفاظ سے جذبات و احساسات کی تعبیر ممکن نہیں۔ جب ان سے مشاہدۂ کائنات کی تصویر کشی نہیں کی جاسکتی تو آخر نفس کے احساسات کیسے پیش کئے جاسکتے ہیں؟'' (۱۱۰/۱)

شیخ علی طنطاوی عربی زبان کے ماہر ادیب ہیں۔ انھوں نے جو کچھ تحریر کیا وہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ صاف، مدلّل اور سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہہ دینا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ صحیح معنیٰ میں جدید عربی ثقافت کے نمائندہ ہیں۔ انھوں نے دینی اور عصری علوم کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ عربی زبان، ادب اور قواعد کے مسائل پر انہیں پورا عبور حاصل ہے۔ انھوں نے جدید و قدیم قوانین کی عمیق اور ٹھوس معرفت حاصل کی تھی۔ اس پورے سرمایے کا ان کے اسلوب اور طرز تحریر پر براہ راست اثر مرتب ہوا۔ چنانچہ ان کی کتاب 'ذکریات' کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک طرف قرآن مجید کے الفاظ اور اسالیب ملیں گے (۱/۱۵۱، ۲/ ۵۸) تو دوسری طرف بے شمار جدید الفاظ اور اسالیب سے بھی واسطہ پڑے گا۔ (۱/ ۹۱، ۹۹، ۱۰۷-۲/ ۵۷، ۱۵۲) اسی طرح اگر ایک طرف قدیم عربی شاعری سے جگہ جگہ استشہاد ملے گا (۱/ ۸۹، ۱۱۳، ۲/ ۲۰۹) تو دوسری طرف جدید عامی زبان کے بہت سے الفاظ، تراکیب اور محاورے ملیں گے۔ (۱/ ۸۸، ۱۹۴) اس طرح یہ کتاب جدید و قدیم اسالیب کے درمیان ایک معتدل اور دونوں سے مستفاد اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔ مصنف جاحظ سے بہت متأثر ہیں، اس لیے ان کے 'اسلوبِ مرسل' کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے۔ طرز استدلال منطقی ہے۔ اپنی بات پیش کرنے کے لیے تمثیلات اور تشبیہات سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ یہ تمثیلات اور تشبیہات بڑی برمحل معلوم ہوتی ہیں اور ان سے ان کا مفہوم ومدّعا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر انھوں نے ایک جگہ امت مسلمہ کے خلاف مغربی طاقتوں کی پیہم سازشوں، امت کی غفلت، بعد میں اس کے اندر بیداری کی ہلکی سی لہر اور پھر گہری نیند کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہماری مثال جنگل کے اس شیر کی طرح ہے جس کی سیادت کا جب جنگل میں ڈنکا بج گیا اور بھیڑیے اس سے چھپ گئے اور وہاں کوئی اس کا مد مقابل نہیں بچا تو وہ آرام سے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا، پھر اسے نیند آئی

اور وہ سو گیا۔ اس کی گہری نیند کے دوران بھیڑیے اور لومڑیاں بیدار ہو گئیں اور انھوں نے اپنا اپنا کام کیا، لیکن شیر بہر حال شیر رہتا ہے خواہ وہ کتنی ہی گہری نیند سو جائے۔ جوہر کبھی اپنی تاثیر اور اصلیت بدل نہیں سکتا، خواہ اسے کتنے ہی کیچڑ میں پھینک دیا جائے ..... بلاشبہ یہ شیر بیدار ہوا چاہتا ہے۔ وہ انگڑائی بھی لیتا ہے لیکن اس پر دوبارہ نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتا ہے''۔ (۱/۲۰۹)

اس کتاب کا ہر صفحہ فصیح عربی زبان کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے۔ بعض صفحات اور بعض عبارتوں کو کئی کئی بار پڑھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ امر انتہائی قابل افسوس ہے کہ انسانی، اخلاقی اور دینی اقدار کے حامل ادباء کو اور زبانوں کی طرح عربی زبان وادب میں بھی وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کے بجائے مخرّبِ اخلاق، مفسدِ ذہن اور مادہ پرست ادباء کو داد و دہش اور اجر و انعام سے نوازا جاتا ہے۔ شیخ علی طنطاوی کے معاملہ میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا، ورنہ ان کی شگفتہ اور شستہ زبان و بیان کی آج ہر طرف سے ستائش کی جاتی۔ بہر حال! اگر آج کا زمانہ ایسے باضمیر اور غیور ادباء کی قدر نہیں کرتا تو امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ آنے والی نسلیں اس کی تلافی کریں گی۔

یہ کتاب چونکہ خودنوشت سوانح حیات نہیں ہے، اس لیے اس پر آپ بیتی کی حیثیت سے فنی گفتگو کرنا لاحاصل ہے۔ یہ کتاب تو کچھ منتشر یادوں کا مجموعہ ہے جسے تحریر کرنے کا کوئی منصوبہ، لائحہ عمل اور پروگرام پہلے سے مصنف کے ذہن میں نہیں تھا۔ البتہ اخیر میں اس احساس کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں صرف اپنے حسین تجربات اور عمدہ حکایات کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی زندگی کے بعض دوسرے پہلو، جو ان کی شخصیت کے منفی گوشوں کو نمایاں کرتے، اس کتاب میں سرے سے ناپید ہیں۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں زندگی کے مثبت پہلوؤں کے پیش کرنے پر اس قدر زور دیا ہے کہ کہیں کہیں غیر شعوری طور پر وہ فخر و غرور میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ (۲/۵۴، ۶۶، ۱۱۲) لیکن بہر حال ایسا بہت کم مقامات پر ہوا ہے اور بالعموم انھوں نے

خود اسے محسوس کر کے اس سے براءت کا اظہار کر دیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''مکتب عنبر سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ میں نے عربی زبان اور عربی علوم پر مکمل دسترس حاصل کر لی۔ میں معذرت خواہ ہوں، میں نے یہ بات فخر کے باعث نہیں کہی ہے، بلکہ میں اس کا بطور تحدیث نعمت ذکر کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ''۔ (۱/۱۵۳)

خلاصہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'ذکریات' صرف شام ہی نہیں بلکہ تمام عرب ممالک کی سیاسی، تعلیمی، ادبی اور دینی تحریک کی عظیم الشان دستاویز ہے، جس میں حقائق کے ساتھ مصنف کا فکر پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اس کے مولف رافعی اسکول کے روشن چراغ، محبّ الدین الخطیب کی فکر کے علم بردار، کرد علی کے تاریخی افکار و نظریات کے مبلغ اور خود ایک نئے طرز بیان کے موجد تھے۔ ان کی 'ذکریات' میں اگر چہ فنی لحاظ سے بعض کمیاں موجود ہیں، اس کے باوجود یہ ادب اور تاریخ کے طالب علموں اور محققین کے لیے بہت سی قیمتی معلومات بہم پہنچانے اور ان کے جذبات و احساسات کو آسودہ اور مطمئن کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

کم زور اور مظلوم اسلام کے سایے میں

مولانا سید جلال الدین عمری

اس کتاب میں انسانی حقوق کے سلسلے میں اسلام کے امتیازات کو واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلامی شریعت میں کم زور کی، کن کن پہلوؤں سے رعایت کی گئی ہے؟ اور اس کے مسائل کس طرح حل کیے گئے ہیں؟ ظلم سے اس کی حفاظت کے لیے کیا کیا اقدامات کیے گئے ہیں؟ اور مظلوم کے کیا کیا حقوق بیان کیے گئے ہیں؟ آخر میں یہ اہم بحث بھی ہے کہ اسلام نے مظلوم کے لیے انتقام کا حق تسلیم کیا ہے، لیکن اسے شرعی حدود کا پابند بنایا ہے۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر قرآن و سنت کے محکم دلائل کی روشنی میں تحقیقی انداز میں مبسوط گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: ۱۱۶، قیمت عام ایڈیشن: -/۳۵ روپے۔ خاص ایڈیشن: -/۵۰ روپے

ملنے کے پتے: ۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲

۲- مرکزی مکتبۂ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵